Rs. 15/-
October 2021

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

آزاد ہندوستان کی بنیادیں

’’تین شرطیں ہیں جب تک یہ رہیں گی ہندوستان آزاد رہے گا، پُر امن رہے گا، خوش حال رہے گا اور محبت کا گہوارہ رہے گا، (۱) سیکولرزم، (۲) ڈیموکریسی، (۳) نان وائلنس، یہ تین چیزیں ہیں جو ضروری ہیں ملک کی بقا کے لیے، یہ رہیں گی تو ملک رہے گا، اسکالرز بھی سن لیں، ہسٹورین بھی سن لیں اور سب سن لیں اور لوح دل پر محفوظ کرلیں، کچھ بھی ہوجائے یہ ملک ان تین چیزوں کے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک یہ کہ ڈیموکریٹ اسٹیٹ ہو، نان وائلنٹ ہو اور سیکولر ہو، اس لیے کہ تقدیر الٰہی نے یہ فیصلہ کردیا ہے (اور خدا کا فیصلہ کوئی بدل نہیں سکتا) اس ملک میں ہندو بھی رہیں گے اور مسلمان بھی، جینی بھی رہیں گے اور بودھ بھی، سکھ بھی رہیں گے اور عیسائی بھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کیوں باہر سے بھیجتا؟ کیوں یہ آسانی پیدا ہوتی؟ یہ ملک اسی طرح رہ سکتا ہے کہ یہ ملک سیکولر ہو۔‘‘

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مركز الإمام أبي الحسن الندوي
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

داعی، دعوت اور طریق دعوت

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ

''امت محمدیہ کے مزاج کے مطابق یہ ضروری ہے کہ داعی، دعوت اور طریق دعوت تینوں چیزیں ٹھیک ٹھیک طریق نبوت اور اسوۂ نبوت کے مطابق ہوں، داعی خود بھی قلباً اور قالباً داعی اول محمد رسول اللہ ﷺ سے نسبت رکھتا ہو، جس حد تک یہ نسبت قوی ہوگی دعوت میں تاثیر اور کشش پیدا ہوگی، پھر ضروری ہے کہ دعوت وہی ہو یعنی خالص اسلام اور ایمان اور عمل صالح کی دعوت ہو، پھر دعوت کا طریق بھی وہی اختیار کیا جائے جو داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اختیار فرمایا تھا، جس حد تک ان تینوں امور میں عہد رسالت ونبوت کے ساتھ قرب ومناسبت جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ دعوت کی قوت میں تاثیر اور دعوت کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوگی اور راہ کی ضلالت سے حفاظت اور صراط مستقیم کی طرف رہبری کی طاقت میں اضافہ ہوگا، گذشتہ صدیوں کے جن داعیان امت کے تجدیدی کارناموں کو امت نے تسلیم کیا ہے، ان کی تاریخ سے بھی ان اصولوں کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔

الغرض ضرورت یہ ہے کہ داعی اپنے علم وعمل، فکر ونظر، طریق دعوت اور ذوق وحال میں انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہو، صحت ایمان اور ظاہری عمل صالح کے ساتھ اس کے باطنی احوال بھی منہاج نبوت پر ہوں، محبت الٰہی، خشیت الٰہی، اخلاق للہ، تعلق مع اللہ کی کیفیت ہو، اخلاق وعادات وشمائل میں اتباع سنن نبوی کی کیفیت ہو، حب للہ، بغض للہ، رأفت ورحمت بالمسلمین اور شفقت علی الخلق اس کی دعوت کا محرک ہو اور انبیاء علیہم السلام کے بار بار دہرائے ہوئے اصول کے مطابق سوائے اجر الٰہی کی طلب کے کوئی مقصود نہ ہو، ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ اور اس کی طلب کی ایسی دھن ہو کہ جاہ ومنصب، مال ودولت، عزت وشہرت اور نام ونمود اور ذاتی آرام وآسایش کا کوئی خیال راہ میں مانع نہ ہو، اس کا بیٹھنا، اٹھنا، بولنا، چالنا غرض اس کی زندگی کی ہر جنبش وحرکت اسی ایک سمت میں سمٹ کر رہ جائے۔

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

(از: مقدمہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت: ۱۴-۱۵)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۳ — اکتوبر ۲۰۲۱ء - ربیع الاول ۱۴۴۳ھ — شمارہ: ۱۰

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

انسان کا اصل مال

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"أَيُّكُمْ مَالُ وَارِثِهِ أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنْ مَالِهِ؟ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا مِنَّا أَحَدٌ إِلَّا مَالُهُ أَحَبُّ إِلَيْهِ، قَالَ: فَإِنَّ مَالَهُ مَا قَدَّمَ وَمَالُ وَارِثِهِ مَا أَخَّرَ"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(تم میں کون شخص ایسا ہے جس کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال محبوب ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں ایسا کوئی نہیں ہے جسے اپنا مال زیادہ پیارا نہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلاشبہ اس کا مال تو وہ ہے جو اس نے (راہ خدا میں) آگے بھیج دیا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو وہ چھوڑ کر مرا)

(صحيح البخاری: ٦٤٤٢)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15 — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

ملک کے استحکام کی بنیادیں (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

اقلیتی صورت میں مسلمانوں کی ذمہ داری.....۴

.....مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

انسانی اور آسمانی نظام کا فرق.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

سچائی کیا ہے؟.....۸

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

مسلمانوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟.....۱۰

.....مولانا عزیز الحسن صدیقی

معیار فضیلت.....۱۲

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

زکوٰۃ کے چند مسائل (۳).....۱۴

.....مفتی راشد حسین ندوی

اسلام اس تغیر پزیر زمانہ میں.....۱۶

.....مولانا محمد ناظم ندوی (مانک منو، سہارنپور)

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے.....۱۸

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

اجتہاد کے میدان میں جمود و تعطل - مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب..۱۹

.....محمد نفیس خاں ندوی

غم بھی اک منزل راحت کا نشاں ہوتا ہے

نتیجۂ فکر:- عامر عثمانی

دل پہ وہ وقت بھی کس درجہ گراں ہوتا ہے
ضبط جب داخل فریاد وفغاں ہوتا ہے

کیسے بتلائیں کہ وہ درد کہاں ہوتا ہے
خون بن کر جو رگ و پے میں رواں ہوتا ہے

عشق ہی کب ہے جو مانوس زباں ہوتا ہے
درد ہی کب ہے جو محتاج بیاں ہوتا ہے

جتنی جتنی ستم یار سے کھاتا ہے شکست
دل جواں اور جواں اور جواں ہوتا ہے

واہ کیا چیز ہے یہ شدت ربط باہم
بارہا خود پہ مجھے تیرا گماں ہوتا ہے

کتنی پامال امنگوں کا ہے مدفن مت پوچھ
وہ تبسم جو حقیقت میں فغاں ہوتا ہے

عشق سرتاپا آتش سوزاں ہے مگر
اس میں شعلہ نہ شرارہ نہ دھواں ہوتا ہے

کیا یہ انصاف ہے اے خالق صبح گلشن
کوئی ہنستا ہے کوئی گریہ کناں ہوتا ہے

غم کی بڑھتی ہوئی یورش سے نہ گھبرا عامر
غم بھی اک منزل راحت کا نشاں ہوتا ہے

مدیر کے قلم سے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ملک کے استحکام کی بنیادیں

ملک کو آزاد کرانے والوں اور اس کے اولین قائدین نے اس کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی تھی، سیکولرزم (secularism)، عدم تشدد (non violence)، جمہوریت (democracy)، وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، مسلمانوں کے سات سو سالہ اقتدار میں بھی ایک مذہب کو زبردستی کبھی مسلط نہیں کیا گیا، ہر شخص کو اپنے دین پر عمل کرنے کی آزادی رہی اور یہی وجہ رہی ہے کہ ملک ہر طرح کی خانہ جنگیوں سے بچا رہا اور ترقی کے راستہ پر گامزن رہا، انگریزوں نے جب ملک کو آکر لوٹا ہے اس وقت اس کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا، اس چمن کو سات سمندر پار رہنے والوں نے اجاڑا، پھر اہل چمن بیدار ہوئے اور انہوں نے اس کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرایا، اس آزادی میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب دوش بدوش شریک رہے، آزادی کے بعد ملک کا قانون آزادی کے اسی بنیادی نظریہ کو سامنے رکھ کر بنایا گیا، جس میں ہر ایک کو اس کا حق دیا گیا۔

اس کے بعد خود غرضی کا دور شروع ہوا، حالات بگڑنے لگے، اپنے اپنے مفادات کے لیے ملک کے اصولوں کو بھی پس پشت ڈالا جانے لگا، دوریاں بڑھنے لگیں اور پھر مذہبی منافرت نے حالات کو دوسرے رخ پر ڈال دیا۔

تحریک پیام انسانیت کے بانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دوررس نگاہ دیکھ رہی تھی کہ ملک کی بنیادوں کو کمزور کرنے کا کام شروع ہوگیا ہے، اس لیے مولانا نے بار بار یہ بات کہی اور ڈنکے کی چوٹ پر کہی، ملک کے بڑے سے بڑے عہدہ داروں سے کہی کہ ملک تین بنیادوں پر کھڑا ہے، ان کو اگر کمزور کیا گیا تو ملک خطرہ میں پڑ جائے گا، وہ کہتے کہتے اس دنیا سے رخصت ہوگئے، افسوس کی بات ہے کہ بجائے ملک کو بچانے اور اس کو مضبوط کرنے کے آج اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کیا جا رہا ہے، سیکولرزم کو جس طرح مذہبی منافرت کے بڑھتے رنگ نے کمزور کر دیا ہے، وہ ہر شخص جانتا ہے، اسی طرح تشدد کے بڑھتے ہوئے مزاج نے آپسی محبت و بھائی چارہ کی فضا کو جس طرح مسموم کر دیا ہے، اس سے ایک شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نظر نہیں آتا، زندگی کا مزہ محبت و آشتی میں ہے اور یہی چیز ناپید ہوتی جا رہی ہے، اسی طرح جمہوریت کا جس طرح گلا گھونٹا جا رہا ہے وہ بھی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے، صاف لگتا ہے کہ کشتی بھنور میں ہے اور ملاح بے خبر ہیں، اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ جس سے جو بن پڑے وہ ملک کو بچانے کے لیے کر گذرے، اس کے سیکولرزم کے ڈھانچے کو مضبوط کر کے عدم تشدد کا مزاج بنایا جائے اور انسانیت کی دہائی دی جائے، ہر انسان کے دل میں انسانیت کی چنگاری موجود ہے، اس کو فروزاں کرنے کی ضرورت ہے، محبت و ہمدردی کی فضا بنائی جائے اور لوگوں کے دماغوں میں جو زہر گھولا جا رہا ہے اس کو صاف کرنے کی کوششیں کی جائیں، تاکہ امن و امان اور بھائی چارہ کا ماحول پیدا ہو، اسی طرح اس کی صاف ستھری جو شبیہ رہی ہے اس کو بحال کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، گھر گھر محبت و انسانیت کی بات پہنچائی جائے اور اپیل کی جائے کہ ہر شخص ملک کے لیے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرے، ایک دوسرے کو کمزور کرنے کے لیے اگر صلاحیتوں کا استعمال ہوگا تو اس سے ملک کا نقصان ہے، اس لیے تینوں بنیادی ستونوں (pillars) کو مضبوط کیا جائے اور اس کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کی جائیں۔

یہ تینوں وہ بنیادیں ہیں کہ اگر یہ مضبوط ہوں گی تو ملک مضبوط ہوگا اور ترقی کرے گا، ورنہ ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

اقلیتی صورت میں مسلمانوں کی ذمہ داری

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ایک ایسے ملک میں جس میں اسلام ایک محکومانہ مذہب کی حیثیت رکھتا ہو اور مغربی اقدار اور غیر اسلامی طرز معاشرت کی بالادستی ہو اور جس میں ذاتی منافع اور سیاسی و جماعتی فائدوں ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا ہو اور لذت کو ایک فلسفہ کی شکل دے دی گئی ہو، جس میں تمام تر اعمال واخلاق اور کاوشوں کا محور اسی کو سمجھا جانے لگا ہو، ایسے ملک میں مسلمانوں کی (جب کہ وہ وہاں اقلیت میں ہوں) بہت ہی نازک ذمہ داری ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ان میں غیر متزلزل ایمان ہو، جرأت مندانہ کردار ہو، وہ پوری حکمت عملی سے کام لیں، پھر ان میں اس پیغام ودعوت پر پورا اعتماد ہو، جس سے اللہ نے ان کو مشرف فرمایا ہے، یہ بھی ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کا ایک بلند معیار ہو اور وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہونے پائیں، اگر وہ اس بلند معیار پر نہ ہوئے تو وہ اپنی ذات کو اور اپنی قوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں گے، اس صورت میں وہ کوئی مؤثر اور اہم کردار ادا نہیں کر سکتے جو لوگوں کی توجہ کو مرکوز کر سکے اور کچھ تبدیلی عمل میں لا سکے۔

میں آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں، جس سے آپ کے سامنے بات بالکل واضح ہو جائے گی اور ایک ایسے غیور مسلمان کا کردار بھی آپ کے سامنے آئے گا جس کو اپنی دعوت اور پیغام پر پورا اعتماد تھا اور یہ ظاہری شان وشوکت اور دلفریب مناظر اس کی نظر میں ٹھیکروں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے اور ظاہری عیش وعشرت پر جینے مرنے والوں اور جاہلی زندگی گذارنے والوں پر اس کو ترس آتا تھا، یہ تاریخ اسلام کے قرن اول کا واقعہ ہے۔

ایرانی فوج کا سب سے بڑا قائد جس کو رستم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کو اپنے دبدبہ اور شان وشوکت میں شہنشاہ ایران کے قریب ہی سمجھا جاتا تھا، اس نے لشکر اسلام کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو پیغام بھیجا کہ کسی ایسے آدمی کو بھیج دیا جائے جو اس مقصد کی وضاحت کرے جو عرب کے صحرانشینوں اور بدوؤں کو ان متمدن ملکوں تک لے آیا جو تہذیب وتمدن اور عسکری قوت میں نقطہ عروج پر ہیں اور ملک عرب کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔ اب غور کیجیے کہ وہ آدمی جو تخت سیادت وقیادت پر بیٹھا ہوا ہے اور ایک بڑے رقبہ پر اس کی حکومت ہے، اس کا عربوں کے بارے میں کیا تاثر ہوگا جو خیموں اور کچے مکانات میں بود وباش رکھتے تھے اور جن کا گزارہ کھجور اور اونٹ کے گوشت پر تھا، وہ کس لاپرواہی اور حقارت کی نگاہ سے عربوں کی طرف دیکھتا ہوگا، اس نے کہلوایا کہ کوئی ایسا آدمی بھیج دیا جائے جو اس مقصد ومحرکات کی ترجمانی کردے جو ان کو یہاں لائے ہیں۔

یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ اس نے تمام عربوں کو فکر وعقیدہ وایمان باللہ اور مقصد اسلام پر ناز وفخر کے ایک بلند اور بالا معیار پر پہنچا دیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت ربعی بن عامر کا انتخاب فرمایا، یہ حضرت ربعی جن سے اکثر علمائے تاریخ وسیر ناواقف ہیں، ان کو لشکر اسلامی میں کوئی شان امتیازی بھی حاصل نہ تھی، میں آپ کے سامنے یہ قصہ کوئی افسانہ کے طور پر نہیں بیان کر رہا ہوں کہ جس میں صرف وقتی مزہ ہے، یا قومی فخر وعزت کا سامان ہے، میں اس لیے آپ کے سامنے اس قصہ کا ذکر کر رہا ہوں، تاکہ آپ اس طاقتور ایمان واعتماد کا جس نے ایرانی لشکروں کے قائد عام رستم کے سامنے اس جرأت مندانہ اور آزادانہ گفتگو پر آمادہ کیا تھا، کچھ اندازہ کر سکیں اور مومن کے کردار، جرأت وعزم اور ایمانی قوت کا، مغربی تہذیب وترقی، اقتدار وغلبہ کے بارے میں اپنے موقف وکردار سے موازنہ کر سکیں، یہاں ہمارا اپنے آپ کے ساتھ، اپنے پیغام کے ساتھ اور اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور مغربی تہذیب جو یہاں

رائج ہے اور جس کو اس وقت معاصر دنیا میں سیادت وقیادت کا مقام حاصل ہے اس کی طرف ہم کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حضرت ربعی بن عامرؓ رستم کے دربار میں تشریف لائے، ان کے لباس میں پیوند لگے ہوئے تھے، معمولی سی تلوار اور ڈھال ان کے ساتھ تھی، ایک معمولی اور پست قد وقامت گھوڑے پر سوار تھے، اسی حال میں قالینوں کو روندتے ہوئے تشریف لائے، پھر گھوڑے سے اترے، وہیں کسی تکیہ سے اس کو باندھ دیا اور رستم کی طرف بڑھنے لگے، ہتھیار ان کے ساتھ تھے، رزہ میں ملبوس تھے اور سر پر خود تھا، خدم وحشم اس پر معترض ہوئے اور کہنے لگے ہتھیار اتار دو، حضرت ربعی بن عامرؓ نے فرمایا: میں خود تمہارے پاس نہیں آیا، تمہاری دعوت پر آیا ہوں، اگر اسی حال میں جانے دیتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس جاتا ہوں، رستم نے کہا کہ آنے دو، حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ اپنے نیزہ کو ان ریشمی قالینوں پر ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے حتی کہ ان میں اکثر قالین پھٹ گئے۔

ربعی رستم کے پاس پہنچے، رستم نے پوچھا کہ عرب کس مقصد سے یہاں آئے ہیں؟ ربعی نے ایمان ویقین کے ساتھ جو انکے رگ وریشہ میں سرایت کر چکا تھا اور بھرپور اعتماد کے ساتھ جس نے انکے اعصاب کو مضبوط بنادیا تھا، اس لیے کہ ان کی پشت پر جو چیز کارفرما تھی وہ آسمانی کتاب تھی، نبوت صادقہ تھی، غیر متزلزل ایمان اور پختہ عقیدہ تھا، بلند ہمت تھی اور تیر بہدف نگاہ تھی، انہوں نے فرمایا: ہم کو اللہ نے اس لیے بھیجا ہے تا کہ ہم ان لوگوں کو جن کو اللہ چاہے بندوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی میں لے آئیں، دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت میں لائیں اور مذاہب کے جور وستم سے نکال کر اسلام کا عدل وانصاف عطا کریں۔

بزرگو! اسلام کے پیغام ودعوت اور اس کے بنیادی مقصد کے بارے میں حضرت ربعیؓ نے جو فرمایا، اس پر کامل یقین کے ساتھ اور جو انہوں نے لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف لانے اور دوسرے مذاہب کے جور وستم سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کی راہ دکھانے کا ذکر فرمایا، اس پر کوئی حیرت واستعجاب نہیں ہوتا کہ یہ ان کے عقیدہ اور یقین کی بات تھی، لیکن مجھے ان کے اس جملہ پر بڑی حیرت واستعجاب ہے، جس میں انہوں نے فرمایا کہ ہمیں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ "دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعت کی طرف لائیں" اگر وہ دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں لانے کا ذکر فرماتے تو مجھے ادنیٰ تعجب نہ ہوتا، اس لیے کہ یہ تو ایسی حقیقت ہے جس پر ہر مسلمان اور صاحب ایمان یقین رکھتا ہے اور حضرت ربعیؓ کا واقعہ تو قرن اول کا ہے، میں ان کے اس جملہ پر غرق حیرت ہو جاتا ہوں کہ ہم تم کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا کی وسعتوں میں لانا چاہتے ہیں، گویا کہ وہ فرما رہے ہیں کہ ہم نے اپنے اوپر ترس کھا کر اور ان ملکوں کے عیش وعشرت کی طمع میں اپنے وطن کو ترک نہیں کیا، ہم تو یہاں تم پر ترس کھا کر آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تم کو تنگ وتاریک قید خانے سے آزاد کریں، جس میں تم اس پرندہ کی طرح زندگی گذار رہے ہو جس کو کسی ظرف یا قفس میں بند کر دیا جاتا ہے اور دانہ اور پانی اسی کے اندر دے دیا جاتا ہے، اس لیے کہ تم اپنی عادتوں اور ضرورتوں کے غلام ہو، خواہشات نفس کے غلام ہو۔

بھائیو! میں آپ سے مختصراً کہتا ہوں کہ آپ یہاں آزادانہ، مؤثر اور بنیادی کردار ادا کریں، آپ کی زندگی مثالی ہو، جو لوگوں کی نگاہیں پھیر دے اور توجہ مرکوز کر دے، ذہنوں میں ایسے سوالات پیدا ہوں جو موازنہ کرنے پر مجبور کریں اور اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہو، اگر آپ نے بھی مغربی طرز معاشرت اختیار کر لیا، آپ ان ہی کے مقلد بن گئے اور اپنے بلند معیار سے اپنے کو نیچا گرالیا تو آپ میں اور مغربی باشندوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہ سکتا اور نہ ان میں معلومات کا شوق اور غور وفکر کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے اور نہ آپ کا احترام ان کے دل میں آسکتا ہے، چہ جائیکہ وہ آپ کو قابل تقلید ونمونہ سمجھیں، لیکن جب آپ ان کے سامنے ایک نامانوس طریقہ زندگی پیش کریں گے تو اس سے ان کے اندر ایک جستجو پیدا ہوگی اور وہ آپ سے پوچھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ طریقہ زندگی آپ نے کہاں سے اخذ کیا اور یہ بلند وبالا اقدار واخلاق فاضلہ آپ نے کس سے سیکھے؟ ان میں اشتیاق پیدا ہوگا۔

انسانی اور آسمانی نظام کا فرق

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

دنیا کا رواج اور انسان کا معمول یہ ہے کہ وہ کائنات کے نظام کو اجتماعی زندگی کے حال پر قیاس کرتا ہے، یعنی جس طرح دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ کسی نظام کو بنانے کے متعلق پلاننگ کی جاتی ہے اور پلاننگ کرنے کے بعد اس کو کام کرنے والوں کے سپرد کردیا جاتا ہے کہ تم اس پلاننگ کے مطابق کام کرو اور نظام بنانے والا انسان خود فارغ ہوجاتا ہے، ٹھیک اسی طرح انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا کیا اور سارا نظام بنا کر دوسروں کے ذمہ کردیا، لہٰذا اب فلاں معبود ہماری ضرورت پوری کردے گا، فلاں معبود ہماری مصیبت ہٹا دے گا اور فلاں معبود ہمیں فائدہ پہنچا دے گا، گویا یہ سب انسانوں نے اپنے طور پر طے کرلیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان یاد بھی نہیں رکھتا، بلکہ وہ اسی خیال میں بھٹکا رہتا ہے کہ جس طرح دنیا میں ایک چھوٹے افسر سے کام چل رہا ہے تو بڑے افسر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے اپنے چھوٹے چھوٹے افسر بنادیے ہیں جو انسانوں کے کاموں کو انجام دیں گے اور نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ فارغ ہوگیا ہے تو ہم اس کے پاس کیوں جائیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کو اپنا کارساز سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری ضرورتیں پوری کردیں گے اور اللہ تعالیٰ کو تم یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً سارا عالم بنایا ہے، مگر اس نے بنانے کے بعد دوسروں کے سپرد کردیا ہے، یہ ایک دھوکہ ہے اور بہت ہی سطحی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پورا نظام بنا کر ہر چیز اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے اور بیچ میں واسطے نہیں رکھے ہیں، حتی کہ انبیاء بھی واسطہ نہیں ہیں، جب کہ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیت اور سب سے بڑا مقام انبیاء کا ہے، مگر انبیاء بھی بیچ میں واسطہ نہیں ہیں، دعا مانگنے کے متعلق اللہ نے کہا کہ ہم سے براہ راست دعا مانگو، ہم سے براہ راست تعلق رکھو، بیچ میں واسطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ (البقرۃ: ۱۸۶) (اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں ہر پکارنے والے کی پکار میں سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو ان کو بھی چاہیے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ سعادت سے ہم کنار ہوں)

جو لوگ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، یا جو لوگ بدعت میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اسی غلطی کا شکار ہوجاتے ہیں کہ وہ بیچ میں واسطے بنا لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ فلاں شخص بزرگ ہوگیا تو گویا اللہ کا پسندیدہ ہوگیا، لہٰذا اب وہ اللہ کی طرف سے جو چاہے کرے، اللہ تعالیٰ اس کی رعایت کرے گا، اگر وہ چاہے تو کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، گویا ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اس شخص میں ایک طریقہ سے اللہ تعالیٰ والی قوت آگئی ہے، اسی لیے قبروں پر جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قبر میں بزرگ ہے تو گویا اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار حاصل ہے کہ وہ لوگوں کی تکلیفیں دور کرسکتا ہے اور وہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، انسانی دلوں میں یہ بات بہت جلدی بیٹھ جاتی ہے اور پھر یہ بات شرک تک پہنچ جاتی ہے، انسان کی کمزوری یہ ہے کہ اس کے ذہن میں ایسی باتیں بہت جلدی آجاتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انسانی نظام میں پلاننگ کرنے والے افسر اعلیٰ یا دوسرے لوگ ہوتے ہیں، خود بادشاہ کچھ نہیں کرتا، بس اس کا حکم اور پالیسی چلتی ہے، باقی کام وزراء کرتے ہیں اور اس کے نیچے کے سکریٹری کرتے ہیں، اسی لیے جس کو اپنا کام کرانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ ہمیں بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ جو شخص

اس کام پر مامور ہے اور جو اس کا سکریٹری ہے، ہم اسی کو راضی کر لیتے ہیں اور خوش کر لیتے ہیں تو کام ہو جائے گا، گویا صرف اس کو راضی کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ بادشاہ کو راضی کرنے کی، دنیا کے اسی نظام کو انسان اللہ تعالیٰ کے نظام پر قیاس کر بیٹھتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شرک تک پہنچ جاتا ہے۔

انسان ابتداء میں شرک خفی میں مبتلا ہوتا ہے، اللہ حفاظت فرمائے اس میں بہت سے لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسباب ووسائل کو متصرف مان لیتے ہیں کہ ان ہی سے سارا کام چلتا ہے، حتی کہ حدیث شریف میں آتا ہے:

"من قال مطرنا بفضل الله ورحمته فذلك مؤمن بي وكافر بالكوكب" (صحيح البخاري: ٨٤٦) (جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی ہے تو وہ میرے اوپر ایمان رکھنے والا اور ستاروں کا انکار کرنے والا ہے)

حدیث کی رو سے یہاں تک کہنا منع ہے کہ بارش موسم کی بنیاد پر ہوئی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بارش اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے نازل کرتا ہے، لیکن نجومی کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ نکلے گا تو ایسا ہوگا، گویا وہ ستاروں کو اصل اور متصرف سمجھتے ہیں، جب کہ دوسری چیزوں کو متصرف سمجھ لینا ہی شرک تک پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذمہ داری دینے کے لیے پیدا کیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ صحیح طریقہ پر ذمہ داری انجام دینے کے نتیجہ میں جنت کا مقام دینا چاہتا تھا اور ظاہر ہے جو لوگ اس ذمہ داری کو امانت داری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں ان کو انشاء اللہ جنت کا مقام ملے گا، لیکن جو لوگ اس سلسلہ میں زیادہ غور نہیں کرتے اور اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، ان کے پاس کان تو ہیں مگر وہ ذمہ داری انجام دینے میں حق بات نہیں سنتے اور ان کے پاس دل تو ہیں مگر وہ حق بات قبول نہیں کرتے اور نہ ہی حقیقت تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ وہ وسائل پر اعتماد رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی کارساز حقیقی ہیں، ان کے بغیر کوئی کام نہیں ہوگا اور جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے طلب کی جائے تو کہتے ہیں: ہم اس سے براہ راست کہاں کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو بلندی پر ہے، ہم اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف یہ بات کہی ہے کہ ہم سے براہ راست تعلق رکھو اور وسائل کو اصل مت سمجھو، اس کے بعد آدمی کو کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی، بلکہ ہر لمحہ اللہ کو ماننا چاہیے اور ہر چیز اسی سے مانگنا چاہیے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُوْلَـئِكَ كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ☆ وَلِلّهِ الأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُواْ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَآئِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ﴾ (اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جنات اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں، وہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے گئے گذرے ہیں، وہی لوگ غافل ہیں اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں تو ان ہی سے اس کو پکارو اور جو اس کے ناموں میں کجی اختیار کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو جو وہ کر رہے ہیں اس کی سزا ان کو جلد ہی مل جائے گی)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن کو تم نے اپنا معبود سمجھ رکھا ہے، ان سے تم اپنی مصیبتوں کو ٹالنا چاہتے ہو اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو، یہ وہ ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جب ہم دنیا بنا رہے تھے اور یہ پورا عالم بنا رہے تھے تو کیا اس وقت یہ موجود تھے؟ کیا اس وقت ہمارے ساتھ شریک تھے؟ کیا یہ چیزوں کو جانتے ہیں؟ یہ تو وہاں موجود بھی نہیں تھے، تو اب ہم نظام چلانے میں ان سے کیا مدد لیں گے؟ کیا ہم ان کو اپنا واسطہ بنائیں گے؟ کیا ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا کام ان کے سپرد کریں؟ ہمیں اس کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سچائی کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مکی دور کی بنیادی تعلیمات:

عَنْ أَبِی سُفْیَانَ فِی حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ فِی قِصَّةِ هِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ، قَالَ هِرَقْلُ: فَمَاذَا یَأْمُرُکُمْ؟ -یَعْنِی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ- قَالَ أَبُوْ سُفْیَانَ: قُلْتُ: یَقُوْلُ: اعْبُدُوا اللّٰهَ وَحْدَهٗ، وَلَا تُشْرِکُوْا بِهٖ شَیْئًا، وَاتْرُکُوْا مَا یَقُوْلُ آبَاءُکُمْ وَیَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالصِّدْقِ (وَالصَّدَقَةِ) وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ.

(صحیح البخاری، کتاب بدء الوحي: ۷)

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ اپنی لمبی حدیث میں ہرقل کی حکایت بیان کرتے ہیں، ہرقل نے کہا: تم کو کس بات کا حکم دیتے ہیں (یعنی نبی کریم ﷺ) ابوسفیان کہتے ہیں، میں نے کہا: حکم دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو تمہارے باپ دادا کہتے ہیں اس کو چھوڑ دو اور ہم کو نماز، سچائی، صلہ رحمی، صدقہ اور پاک دامنی کا حکم دیتے ہیں۔

حضرت ابوسفیانؓ جب روم تجارت کے لیے گئے تھے، تب یہ واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا، یہ زمانہ ان کے شرک کا تھا، وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اور یہی وہ زمانہ تھا جب اللہ کے رسول ﷺ نے دنیا کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط بھیجے تھے، انہی بادشاہوں میں ایک ہرقل بھی ہے، اس کو بھی آپ ﷺ نے خط بھیجا تھا، ہرقل کا دل نرم تھا اور قریب تھا کہ وہ دعوتِ حق کو قبول کرلے، لیکن سلطنت کی خواہش اور دنیا کی محبت ایسی ہوتی ہے کہ بڑی بڑی سعادتوں سے بعض مرتبہ محروم کردیتی ہے، ہرقل کو بھی یہی ڈر ہوا کہ اس کی سلطنت چلی جائے گی، اس لیے کہ سب لوگ اسلام کے مخالف ہیں، اسی لیے اس کو اسلام کی توفیق نہیں ملی، البتہ اس نے نرمی ضرور اختیار کی، لہٰذا جب اس کو آپ ﷺ کا خط ملا تو اس نے تحقیق کی کہ کیا مکہ مکرمہ کے کچھ لوگ یہاں موجود ہیں؟ اتفاق سے وہاں ابوسفیان موجود تھے اور وہ قریش کے سرداروں میں سے تھے، چنانچہ اس نے ابوسفیان کو بلایا اور ان سے تحقیق کی اور چند سوالات کیے، ابوسفیان خود کہتے ہیں کہ ہرقل نے مجھ سے جو سوالات کیے، اس وقت میرے ساتھ کچھ لوگ بھی وہاں موجود تھے، میرا جی تو چاہتا تھا کہ میں کچھ ادھر ادھر کی بات کہہ دوں، لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے جھٹلا دیا جائے گا، دوسری ایک بات یہ بھی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے اندر عربوں میں ہزار خرابیاں تھیں لیکن جھوٹ نہیں تھا، وہ جھوٹ بہت کم بولتے تھے اور جھوٹ کو بہت ہی معیوب سمجھتے تھے، ان کے یہاں جھوٹ یا نفاق نہیں تھا، جو ان کے اندر تھا وہی باہر تھا، دشمنی ہوتی تو آخری حد تک دشمنی ہوتی اور دوستی ہوتی تو آخری حد تک دوستی ہوتی۔

کذب بیانی کی کوشش:

ہرقل نے ابوسفیان سے جو سوالات کیے، ابوسفیان نے ان کے جوابات ٹھیک ٹھیک دیے، لیکن انہوں نے ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی جن سے ہرقل کو کچھ تکدر پیدا ہوجائے، مگر وہ سمجھدار تھا اور اس نے پوری بات سمجھ لی، پھر اخیر میں اس نے ایک جملہ کہا کہ اگر تم جو کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو تو ایک دن وہ آنے والا ہے کہ جس جگہ میں بیٹھا ہوں، وہ اس جگہ کے بھی مالک ہوں گے اور اس نے آپ ﷺ کے بارے میں احترام کے کلمات کہے، لیکن جو بڑے بڑے پادری وہاں بیٹھے ہوئے تھے، جب اس نے ان کے چہرہ پر اتار چڑھاؤ دیکھا تو مشورہ کیا اور مشورہ میں یہ بات اور زیادہ کھل کر سامنے آگئی کہ وہ اسلام کے مخالف ہیں، لہٰذا وہ سمجھ گیا کہ اگر

میں نے اسلام قبول کرلیا تو میری سلطنت چلی جائے گی، پھر لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے، اسی لیے اس نے بات بنائی اور کہنے لگا کہ میں تو تمہارے مذہب کا امتحان لے رہا تھا کہ تم عیسائیت پر کتنی طاقت کے ساتھ قائم ہو؟

ہرقل نے ابوسفیان سے جو سوالات کیے، ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ تمہارے نبی تمہیں کس چیز کا حکم دیتے ہیں، یعنی ان کی دعوت کیا ہے؟ ابوسفیان کہتے ہیں: میں نے کہا: وہ یہ فرماتے ہیں کہ ایک ہی اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک مت کرو اور تمہارے باپ دادا جو کہتے چلے آئے ہیں سب چھوڑ دو۔

اس جواب میں ابوسفیان نے ایک ایسا جملہ کہا جو آدمی کو دل میں تھوڑا سا چبھتا ہے، یعنی ''باپ دادا جو کہتے چلے آئے ہیں'' ''باپ دادا جو کرتے چلے آئے ہیں'' یہ وہ باتیں ہوتی ہیں جن کو چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے، اسی لیے انہوں نے یہ جملہ خاص طور سے استعمال کیا، تاکہ ہرقل کو ذرا سا یہ خیال پیدا ہو کہ یہ نبی ایک نئی بات لے کر آئے ہیں اور جو پہلے سے ہوتا چلا آرہا ہے اس میں ہر چیز کی نفی کرتے ہیں، لیکن یہ بات ایک حقیقت تھی، قرآن مجید میں کئی جگہ یہ بات کہی گئی ہے کہ مشرکین کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے دادا کو جس پر پایا ہے اس سے ہم نہیں ہٹ سکتے۔

انسانی مزاج:

آدمی کا یہ عام مزاج ہوتا ہے کہ وہ کسی عادت کو آسانی سے نہیں چھوڑتا اور اگر اس کو سماج کو چھوڑنا پڑے، گھر بار کو چھوڑنا پڑے، باپ دادا کی ریت رواج کو چھوڑنا پڑے، تو یہ بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے، لیکن حق تلاش کرنا ہے اور حق تک پہنچنا ہے، تو حق تک پہنچنے کے لیے یہ ساری چیزیں رکاوٹ نہیں ہونی چاہئیں، رکاوٹ بننے والی چیزیں چھوٹی بھی ہوتی ہیں اور بڑی بھی ہوتی ہیں، بڑی باتیں جیسے کہ کہیں کسی کے یہاں باپ دادا شرک کرتے چلے آرہے ہیں تو وہاں شرک ہو رہا ہے، ظاہر ہے اس کو چھوڑنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی حق کی تلاش میں ہے تو اس کو سوچنا پڑے گا، اسی طرح کبھی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں، مثلاً: ہمارے باپ دادا ٹھیک تھے، ایمان پر تھے اور توحید پر تھے، لیکن ان کے یہاں بعض رسمیں تھیں، بعض بدعتیں تھیں جو ہوتی چلی آرہی تھیں، ان کا بھی چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے، لیکن اگر آدمی حق پر آنا چاہتا ہے تو اس کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے یہاں کیا ہوتا چلا آرہا ہے، بلکہ اس کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے کیا فرمایا ہے؟

غرض کہ ابوسفیان نے ہرقل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ ایک اللہ کی بندگی کا حکم دیتے ہیں کہ شرک نہ کرو اور باپ دادا جو کہتے چلے آئے ہیں اس کو چھوڑ دو، اسی طرح آپ ﷺ نماز کا حکم دیتے ہیں، سچائی کا، صدقہ کا، پاک دامنی کا اور صلہ رحمی کا بھی حکم دیتے ہیں، اس جواب کے بیچ میں انہوں نے ایک بات ایسی بھی کہہ دی جس سے گویا ایک ہلکی سی ٹھوکر لگے اور ہرقل یہ سوچے کہ اچھا! باپ دادا جو کہتے چلے آرہے ہیں اس کو چھوڑنا پڑتا ہے، لیکن وہ سمجھدار تھا، اس لیے فوراً بات کو سمجھ گیا۔

ہرقل کی گواہی:

ابوسفیان نے جو باتیں بیان کیں، یہ اس وقت کی ہیں جب مکی دور تھا، یہ مکی زندگی کی بنیادی تعلیمات تھیں، آپ ﷺ وہاں پر ان ہی باتوں کا حکم دیتے تھے، ابوسفیان نے یہ ساری باتیں ہرقل کے سامنے رکھیں، ظاہر ہے یہ وہ بنیادی صفات ہیں کہ انبیاء علیہم السلام ان کی دعوت دیتے چلے آرہے ہیں، ہرقل عیسائی تھا اور اس کے پاس مذہبی تعلیمات تھیں، وہ سمجھدار تھا لہٰذا سمجھ گیا کہ یہ نبی برحق نبی ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن کے متعلق پیشین گوئی فرمائی تھی یہ وہی نبی ہیں، اسی لیے اس نے کہا:

"إن كان ما تقول حقا فسيملك موضع قدمي هاتين" (صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي: ٧)

یعنی اگر تم یہ بات سچ کہتے ہو تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ میں جہاں بیٹھا ہوں وہ اس جگہ کے بھی مالک ہوں گے۔

مسلمانوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟

مولانا عزیز الحسن صدیقی

ہماری بداعمالیوں اور شریعت سے انحراف کے نتیجہ میں ہمارا کیا کچھ چھن گیا ہے اور دنیا میں کس قدر رسوا اور ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں، اس کا شاید ہمیں اندازہ نہیں ہے، طلاق ثلاثہ کو ہی لے لیجیے، یہ زوجین کے درمیان نااتفاقی کی صورت میں علاحدگی اور گھریلو زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک شریفانہ طریقہ ہے جو اسلامی شریعت کی طرف سے ایک نعمت کے طور پر ہمیں حاصل ہے، مگر ہم نے اس کی قدر کرنے کے بجائے بازیچہ اطفال بنالیا، سچ تو یہ ہے کہ یہ طریقہ زوجین کو روز روز کے جھگڑے ٹنٹے اور دائما کل کل سے نجات دلاتا ہے، لیکن ہم نے اپنی بدبختی اور بے تدبیری سے اس کو اپنی رسوائی کا ذریعہ بنالیا ہے۔

ہم جب بھی اس موضوع پر کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو ہمیں سابق وزیر اعظم آنجہانی اٹل بہاری باجپئی کا یہ قول ضرور یاد آتا ہے کہ ”مجھے اسلام کا یہ قانون پسند ہے کہ شادی کے وقت لڑکی کی منظوری کے بغیر نکاح نہیں ہوتا، جب کہ ہندو سماج میں لڑکی کو گائے کی طرح باندھ کر رخصت کر دیا جاتا ہے۔“ اسی طرح بعض حالات میں طلاق رحمت ثابت ہوتی ہے، یاد رہے خواتین کے حقوق کی لڑائی لڑنے والی ایک غیر مسلم خاتون مسز پرمیلا ڈنڈوتے نے اکتوبر ۱۹۹۷ء میں ممبئی میں خواتین کے ایک بڑے جلسہ میں کہا تھا کہ ”اسلام نے بیواؤں کو دوسری شادی کی اجازت دے کر عورتوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے“ لیکن افسوس کہ ہم نے اسلام کی عطا کردہ ان نعمتوں کی ناقدری کی، جب کہ دوسرے لوگ اس کے گن گا رہے ہیں، ہم نے اوپر کی سطروں میں طلاق کو رحمت کہا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۲۰۱۹ء میں سپریم کورٹ نے ایک ہندو بیٹے کو اپنے والدین پر اپنی بیوی کے ذریعہ مظالم کرنے کے سلسلہ میں طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔

فی الاصل ہم اس وقت اس دلدوز سانحہ کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جس نے پوری ملت اسلامیہ کو شرم سار کر دیا ہے، واقعہ احمد آباد (گجرات) کا ہے، جہاں ۲۶ر فروری ۲۰۲۱ء کو لیاقت مکرانی کی ۲۳ر سالہ تعلیم یافتہ بیٹی عائشہ خان نے اپنے شوہر عارف خان اور اس کے اہل خانہ کے سلوک سے عاجز آ کر دریائے سابرمتی میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی، یہ سانحہ ایسا نہیں تھا کہ چپ چاپ سن کر اس کی طرف سے توجہ ہٹالی جاتی، ہمیں اپنے ردعمل سے دنیا کو یقین دلانا چاہیے تھا کہ آئندہ ایسا سانحہ پیش نہیں آنے دیا جائے گا، محسن انسانیت رسول اللہ ﷺ نے چودہ سو سال قبل لڑکیوں کو زندہ درگور کیے جانے سے روکا تھا، وراثت میں شرعی حق مقرر کیا، دونوں کے حقوق وفرائض متعین کیے، صرف مردوں پر ہی نہیں بلکہ عورتوں پر بھی علم حاصل کرنا فرض قرار دیا، پھر ہم کون ہوتے ہیں نبی ﷺ کے عائد کردہ حقوق وفرائض پر ڈاکہ ڈالنے والے؟ مفروضہ جہیز نہ لانے یا کم لانے پر بیویوں پر ستم ڈھانے کا حق ہمیں کس نے دیا؟ رشتہ طے ہونے کے بعد والدین اپنے جگر کے ٹکڑے کو خوشی خوشی گھر سے رخصت کر دیتے ہیں اور لڑکی ہجرت کی زندگی اختیار کر لیتی ہے، پھر جہیز کا مطالبہ کرنا، کثیر رقم طلب کرنا اور لکڑی اور لوہے کی بنی اشیاء جن میں گھن اور زنگ لگتا ہے طلب کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ ناز ونعم میں پلی بیٹی کے مقابلہ میں ان چیزوں کی کیا قیمت ہے؟ جب شریعت نے لڑکی والوں سے سامان جہیز اور نقدی وصول کرنے کا

شوہر کو حق نہیں دیا تو پھر وہ کس منہ سے سوال کرتا ہے اور مطالبہ پورا نہ ہونے پر صنف نازک پر مظالم کے پہاڑ توڑتا ہے اور اس کی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے گھروں کا ماحول سراسر غیر اسلامی ہے اور ہماری اولاد دینی تعلیم اور اچھی صحبت سے محروم ہے، اسے یہ تو معلوم ہے کہ ہم کس خاندان کے ہیں اور ہمارا شجرہ کیا ہے، تاکہ اس پر فخر کر سکے اور دوسروں پر رعب جما سکے اور اپنی شان وشوکت کا مظاہرہ کرے، لیکن ہم جس دین کے ماننے والے ہیں اور رہبر انسانیت حضرت محمد ﷺ کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے اور جب خود نہیں جانتے تو دوسروں کو کیا بتائیں گے؟

ہمیں یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ ہمارا معاشرہ بالکل سڑ گل چکا ہے، اس کی مکمل اوور ہالنگ کی ضرورت ہے، ہم شادی کی تقریبات میں بصد شوق شریک ہوتے ہیں، ساری خرافات، بے پردگی وبے حیائی کے مناظر دیکھتے ہیں، غیروں کی ساری رسمیں اور جہیز کا لین دین ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور ہم دلچسپی کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں، لیکن ہمیں ذرا بھی تکدر نہیں ہوتا جب کہ ہمارا دین ان باتوں کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، اس کے باوجود ہم یہ امید رکھیں کہ اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوگا تو اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوگی؟ نکاح خواں خطبے میں قرآن وحدیث کا حوالہ دیتے ہیں، لیکن ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے اس موقع کے لیے کیا ہدایتیں کی گئی ہیں، ظلم کی حد تو یہ ہے کہ دین مہر زیادہ تر لوگ نقد ادا نہیں کرتے اور ادھار پر گزارہ کرتے ہیں اور مرتے وقت معاف کروا لیتے ہیں، لڑکی کو دیگر قوموں کی طرح جہیز تو دیتے ہیں لیکن وراثت میں شریک نہیں کرتے اور غصہ اور ناراضگی میں تین طلاق سے کم دینا کسر شان سمجھتے ہیں۔

ایک ضروری بات تو رہی جاتی ہے، دنیا بھر میں عیسائی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا نکاح چرچ میں لے جا کر کرتے ہیں، لیکن ہم اتنے معزز اور صاحب مرتبہ ہیں کہ مسجد میں نکاح پڑھوانا کسر شان سمجھتے ہیں، جب کہ عیسائی بادشاہ وقت ہی کیوں نہ ہو مگر اس کو نکاح پڑھوانے کے لیے چرچ جانا ہی پڑے گا اور پادری کے سامنے سر جھکا کر بیٹھنا ہی پڑے گا، ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے اللہ کے گھر سے کیوں دوری بنا رکھی ہے؟ ہم اس وقت حیرت زدہ رہ جاتے ہیں جب ایک مسلمان مسجد میں نکاح پڑھانے پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمہ وقت آدمی پاک نہیں رہتا ہے اور ناپاکی کی حالت میں مسجد میں کیوں کر جا سکتا ہے؟ آپ لوگ تو خواہ مخواہ باتیں بناتے ہیں۔

مسلمان یاد رکھیں اور اس بات کو گرہ باندھ لیں کہ دنیا کو ہمارے جیسے مسلمانوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ ان مسلمانوں کی راہ دیکھ رہی ہے جو اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں اور حکم خداوندی کے مطابق دین میں پورے پورے داخل ہوں نہ کہ آدھے ادھورے، جس وقت ہمارا یہ حال ہوگا اس وقت کسی عائشہ کو عارف خاں سے شکایت ہوگی نہ کسی نعیم الدین کو عارفہ سے!!! اور نہ صرف یہ کہ ہمارے گھروں میں خیر وبرکت ہوگی بلکہ ہمارے پاس پڑوس میں رہنے والے خواہ ان کا تعلق کسی مذہب یا دھرم سے ہو ہمارے قدر شناس اور ہمارے اوپر جان چھڑکنے والے ہوں گے، مشہور کہاوت ہے ''ہم ڈوبے جگ ڈوبا'' اس میں کیا شبہ ہے کہ ہم خراب ہوئے تو ساری دنیا خرابیوں کی آماجگاہ بن گئی، اگر ہم خود کو سنوار لیں اور دین اسلام کے پاکیزہ سانچے میں ڈھل جائیں اور اپنی بیویوں اور اولاد کو بھی اسی سانچے میں ڈھلنے کے مواقع فراہم کردیں تو پوری دنیا سدھر جائے گی، اگر چند مسلمانوں نے بھی ہماری کڑوی کسیلی باتیں ہضم کرلیں اور اپنے فکر وعمل میں تبدیلی پیدا کرلی اور اپنے قول سے نہیں بلکہ عمل سے اسلام کی صداقت وحقانیت ثابت کردی تو ہم کہہ سکیں گے کہ ؎

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

معیارِ فضیلت

عبدالسبحان ناخداندوی

انسانی خلافت جسے ہم کل نسل انسانی کی پیشوائی بھی کہہ سکتے ہیں اس کے سب سے بڑے مستحق حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، پھر آپ کے ذریعہ آپ کی اولاد میں یہ خلافت منتقل ہوئی، آپ کی یہ اولاد دو بنیادی شاخوں میں منقسم ہوئی، ایک بنی اسماعیل کہلائے جو حجاز میں آباد ہوئے، دوسرے بنی اسحاق جس کی نسبت بعد میں آپ کے بیٹے یعقوب کی طرف ہوئی اور وہ بنی اسرائیل کہلائے، یہ شام میں آباد ہوئے، دونوں کی نسلوں کو اس کا دعوی رہا کہ وہ حقیقت میں ملت ابراہیمی کے حقیقی نمائندے ہیں، بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ جاری رہا اور اس مبارک سلسلہ کے ذریعہ خرابیوں کی اصلاح ہوتی رہی، اخیر میں معاملہ اس قدر بگڑ گیا کہ دین موسوی نفسانیت کا شکار ہوکر اہل باطل کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا، اس کی بھرپور اصلاح کے لیے حضرت عیسیٰ بھیجے گئے، تو آپ کے سچے متبعین کی حد تک تو یہ دین صحیح سلامت رہا لیکن بعد میں بدعات وخرافات کے زیر اثر یہ پورا دین ہی اپنی حقیقت گم کر بیٹھا، لہٰذا یہودیت اور نصرانیت محض دعووں کا ایک کھلونا بن گئے، حقیقت ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئی۔

دوسری طرف اسماعیلی شاخ میں ملت ابراہیمی کے خط وخال کسی نہ کسی درجہ میں محفوظ رہے، یہاں حضرات انبیاء کا سلسلہ تو نہیں رہا، لیکن کعبۃ اللہ یعنی حرم محترم کی شکل میں ایک ایسی عظیم الشان نعمت اس نسل کو عطا ہوئی جس نے ملت ابراہیمی کے شعائر اور شرائع کو محفوظ رکھنے میں حضرات انبیاء جیسا کام کیا، ہر سال لوگ حج کے لیے آتے تھے اور مناسک حج انجام دیتے تھے، اس سلسلہ میں مسلسل طرز عمل نے بنی اسماعیل کے دین کی بڑی حد تک حفاظت کی، یہاں تک کہ زمانہ نبوت سے تین سو سال قبل ایک شخص عمرو بن لحی ہوا، جس نے سب سے پہلے اس نسل میں شرک وبت پرستی کی وبا پھیلائی، اس سے پہلے کی تاریخ گرچہ تفصیلاً مذکور نہیں، لیکن صاف اندازہ ہوتا ہے کہ من حیث القوم بنی اسماعیل بھی موحد ہی رہے، بلکہ احادیث صحیحہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن لحی سے پہلے عرب بالخصوص بنی اسماعیل صحیح ملت ابراہیمی پر قائم تھے، گویا موجود تاریخی معلومات کے لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد لگ بھگ دو ہزار سال تک بنی اسماعیل دین توحید کے علم بردار رہے جس طرح بنی اسرائیل ہر دور میں توحید کی نعمت سے سرفراز رہے، بالکل اسی طرح بنی اسماعیل بھی دین توحید پر ثابت قدم رہے اور ابراہیمی نسل کی دونوں شاخیں اپنے آباء واجداد کی ملت پر بہت حد تک قائم رہیں۔

آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے سامنے جہنم پیش کی گئی، میں نے اس میں عمرو بن لحی کو دیکھا جو جہنم میں آپنی آنتوں کو گھسیٹ رہا تھا، اسی نے سب سے پہلے حضرت ابراہیم کے دین کو تبدیل کیا اور بتوں کے نام پر جانوروں کو چھوڑنے کا سلسلہ جاری کیا۔

بعض روایات میں یوں مذکور ہے کہ عمرو بن لحی وہ بدبخت تھا جس نے بت پرستی کی مختلف شکلیں رائج کیں، ارشاد ہے کہ سب سے پہلے جس نے حضرت اسماعیل کے دین میں تبدیلی پیدا کی، بتوں کو نصب کیا، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی کا (مشرکانہ) سلسلہ شروع کیا وہ عمرو بن لحی تھا، اسی نے سب سے پہلے عربوں کو بتوں کی پرستش پر آمادہ کیا۔

یہ بنوخزاعہ کا سردار تھا، قبیلہ جرہم کے بعد بنوخزاعہ ہی حرم کے متولی رہے، اس طرح سب سے پہلے حرم کی حرمت کو پامال کرنے والا بھی یہی بدنصیب شخص ہے۔

ہوسکتا ہے باہر کے اثرات سے انفرادی طور پر بت پرستی کا سلسلہ چل نکلا ہو، لیکن من حیث القوم جس طرح بنی اسرائیل موحد رہے اسی طرح بنی اسماعیل بھی موحد رہے، ہاں عمرو بن لحی کے بعد پھر بنی اسماعیل میں بت پرستی آئی اور یہ معاملہ اس قدر بڑھ گیا کہ آپ ﷺ کے زمانہ تک خانۂ خدا میں تین سو ساٹھ بت نصب کیے جا چکے تھے اور بت پرستی بنی اسماعیل کا قومی مذہب بن گیا، لہٰذا یہ نسل

بھی ملت ابراہیمی سے باہر ہوکر شرک و بت پرستی سے پورے طور پر آلودہ ہوگئی، دعویٰ دونوں کو تھا کہ وہ ملت ابراہیمی کے حقیقی نمائندے ہیں، چونکہ بنی اسرائیل میں نبوت اور کتاب رہی اس لیے وہ اپنے آپ کو حقیقی نمائندہ سمجھتے ہوئے ہمیشہ بنی اسماعیل کو اپنے دائرہ سے خارج سمجھا، بلکہ آگے بڑھ کر وہ خود حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بھی خانوادۂ ابراہیمی میں شامل سمجھنے کو دل سے تیار نہیں رہے، دوسری طرف بنی اسماعیل اس احساس محرومی میں ضرور مبتلا رہے کہ وہ صاحب کتاب اور صاحب نبی نہیں ہیں، لیکن ان کو اس کا ہمیشہ فخر رہا کہ وہ حرم کے پاسبان ہیں اور بیت اللہ کے نام سے اللہ کا پہلا گھر ان کا اپنا ہے اور یہ شرف کسی اور گھر کو حاصل نہیں ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات صاف کردی گئی کہ ملت ابراہیمی جو درحقیقت خلافت وامامت اور امانت کی اساس ہے، اب حضرت ابراہیم کی کسی شاخ میں باقی نہیں رہی، یہود و نصاریٰ اس حقیقت کو گم کرکے محض الفاظ کے سہارے کھیل رہے ہیں، انبیاء کی ہدایات اور کتب مقدسہ کی تعلیمات سے وہ اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ اب اس نام پر واپسی ممکن نہیں، بنی اسماعیل کچھ ظاہری شعائر حج کے نام پر لیے بیٹھے ہیں، لیکن وہ شعار اعظم جس کے لیے اللہ کا یہ گھر بنایا گیا تھا اسے وہ کب کے خیرباد کہہ چکے ہیں، یعنی توحید کی امانت ان کے سینوں سے نکل چکی ہے، اس کی جگہ شرک کی نجاست بھر چکی ہے، لہٰذا یہ حرم مقدس کے لاکھ دعویدار ہوں لیکن حرم حقیقی ان کا نہیں رہا، ہاں حرم کے نام پر جو شرک ہو رہا ہے وہ اسی کے لائق ہیں، مزید یہ بھی واضح کیا گیا کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، موسیٰ، عیسیٰ سب ایک تھے، ان میں سے کسی کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھا نہیں جاسکتا، سب ملت ابراہیمی کے حقیقی سچے نمائندے تھے، البتہ موسیٰ کے نام پر جو یہودیت وجود میں آئی اور عیسیٰ کے نام پر جو نصرانیت پیدا ہوئی، اس کا تعلق ملت ابراہیمی سے تو ہے ہی نہیں خود موسیٰ و عیسیٰ سے بھی نہیں رہا، اب ایک مقدس اور مبارک ہستی کے سر پر ملت ابراہیمی کا تاج رکھا جارہا ہے اور حرم کا حقیقی پاسبان بھی اسی کو بنایا جارہا ہے۔

قرآن میں قبلہ کی تحویل کا حکم دے کر یہ اعلان کیا کردیا گیا کہ مرکز اسلام کعبہ ہے اور اس کے حقیقی حقدار محمد ﷺ ہیں، ایک طرف یہ مبارک شخصیت اسماعیل کی نسل سے ہے، لہٰذا عرب اس کے سایہ تلے آجائیں، یہ ابراہیم کی دعا ہیں، لہٰذا ملت ابراہیمی کی چاہت رکھنے والے ان کو تسلیم کرلیں، تنہا یہی حقیقی علم بردار ہیں، دوسری طرف یہ موسیٰ پر اتری ہوئی توریت میں بیان کردہ نبی منتظر ہیں، لہٰذا تمام یہود و بنی اسرائیل ان کو اپنا واحد رہنما تسلیم کرلیں، یہ عیسیٰ کی بشارت ہیں، لہٰذا کل نصاریٰ کے لیے یہی شخصیت مرکز محبت اور مرجع عقیدت قرار دی جارہی ہیں، اب نسلی بنیاد پر فضیلت کا سلسلہ نہیں رہا، اب مشن اور دعوت کی بنیاد پر افضلیت اور استحقاق کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس باب میں سب کے لیے یکساں راہیں رکھی گئی ہیں، بیت المقدس کی عظمت اپنی جگہ، لیکن اس ملت کے نمایاں شعار کے طور پر کعبۃ اللہ کو ہمیشہ کے لیے قبلہ مقرر کیا جاتا ہے، اس لیے یہود اپنی ضد و ہٹ دھرمی سے باز آجائیں، دین اللہ کا ہے، اس لیے حکم الٰہی کی فرمانبرداری ہی اصل دین داری ہے۔

دوسری طرف تحویل قبلہ کا حکم بیان کرکے کعبۃ اللہ کو مرکز توحید قرار دے کر اس کی اصلی پہچان دوبارہ دی جاتی ہے، لہٰذا مشرکین شرک کی آلودگی کے ساتھ وہاں کے پاسبان نہیں رہ سکتے، وہ ایمان لائیں ورنہ پھر نتیجہ کے لیے تیار رہیں، محمد ﷺ کے متبعین بھی جان لیں کہ ان کو کسی خاص لقب یا نام کی بنیاد پر یہ منصب نہیں دیا جارہا ہے، بلکہ ان کی حقیقی پہچان "صبغة الله" ہے اور اس سے بہتر اور کوئی پہچان یا رنگ نہیں ہوسکتا اور ان کی ابدی و دائمی حقیقت "والذين آمنوا أشد حبا لله" ہے، لہٰذا اللہ کی بے پناہ محبت میں سرشار رہ کر وہ اللہ کے لیے سب کچھ قربان کرتے رہیں گے تو ہی منصب ان کے ہاتھ میں ہمیشہ رہے گا، ورنہ ایک قوم کو ہٹا کر دوسری قوم وہاں لائی جائے گی، اللہ کے لیے سب کچھ قربان کرنے کے جذبہ کے ساتھ ملت ابراہیمی کی یہ امانت تمہیں مبارک ہو، لیکن اس کے لیے سب سے کامل سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ نمونہ محمد ﷺ کا ہے۔

زکوٰۃ کے چند مسائل ۳

مفتی راشد حسین ندوی

گذشتہ قسطوں میں زکوٰۃ کے متعلق چند اصولی باتیں عرض کی گئی ہیں، اس تحریر میں زکوٰۃ کے چند ضروری متفرق مسائل بیان کیے جارہے ہیں، مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاچکا ہے، لیکن انکی اہمیت کے پیش نظر مناسب یہی ہے کہ ان کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے:

(۱) روپئے یا چاندی کو سونے سے ضم کرنا: اگر کسی کے پاس سونے کے زیورات ہوں، وہ سونے کے نصاب یعنی ۸۷ گرام سے کم ہوں، لیکن ان کے ساتھ کچھ چاندی کے زیورات ہوں، یا کچھ روپئے پیسے یا سامان تجارت ہو اور اس پر سال گزر چکا ہو تو ایسی صورت میں مفتی بہ قول کے مطابق ان کا ضم کرکے دیکھا جائے کہ کیا دونوں مل کر سونے یا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائیں تو زکوٰۃ واجب ہوجائے گی، چونکہ آج کل سونے کے مقابلہ میں چاندی بہت سستی ہے، لہٰذا سونے کے ساتھ کچھ بھی چاندی روپیہ یا مال تجارت ہو تو چاندی کے نصاب تک ان کی قیمت پہنچ جاتی ہے اور مفتی بہ قول کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے۔

(ہندیہ: ۱/ ۱۷۹، شامی: ۲/ ۳۷)

اوپر جو کچھ لکھا گیا جیسا کہ ذکر بھی کیا گیا مفتی بہ قول کے اعتبار سے ہے، ورنہ امام شافعی کے نزدیک ایک نصاب کو دوسرے میں ضم نہیں کیا جائے گا اور خود احناف کے یہاں صاحبین کے نزدیک ضم تو کیا جائے گا، لیکن اجزاء کے اعتبار سے نہ کہ قیمت کے اعتبار سے، یعنی اگر سونے کا نصف نصاب اور چاندی کا نصف نصاب یا سونے کا ایک چوتھائی نصاب اور چاندی کا تین چوتھائی نصاب ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ (شامی: ۲/ ۳۷) صاحبین کے قول کا اعتبار کیا جائے تو زکوٰۃ کا وجوب ذرا زیادہ مقدار میں سونا چاندی ہونے پر ہوگا، مفتی بہ قول کے اعتبار سے سونے اور چاندی کی معمولی مقدار ہونے پر بھی زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو دقت ہوتی ہے، تو احتیاط اسی میں ہے کہ دقت ہونے پر کسی ایک چیز کو ملکیت سے نکال دیں، گھر کے کسی دوسرے فرد کو مالک بنادیں تاکہ زکوٰۃ بھی واجب نہ ہو اور مفتی بہ قول نہ چھوڑنا پڑے، البتہ اس مسئلہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس طرح کے لوگوں پر زکوٰۃ کی ادائیگی کو اولیٰ اور بہتر قرار دیا ہے، وجوب کی بات نہیں لکھی ہے۔

(کفایت المفتی: ۴/ ۳۵۴-۳۵۵) واللہ اعلم

کسی کام کے لیے جمع رقم پر زکوٰۃ: اگر کسی شخص نے مکان کی خریداری، تعمیر، یا بچوں میں سے کسی کی شادی یا حج کے لیے رقم اپنے پاس (خواہ گھر میں یا بینک میں) جمع کر رکھی ہے تو ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بشرطیکہ وہ خود یا دوسری رقم کے ساتھ مل کر زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچ رہی ہو) (شامی: ۲/ ۷)

فکس ڈپازٹ اور انشورنس میں جمع رقم پر زکوٰۃ: بینک میں فکس ڈپازٹ کرانا یا عام حالات میں انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی نے فکس ڈپازٹ کرا ہی لیا تو اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ اپنے وقت پر اس کا ملنا یقینی ہے، لہٰذا یہ دین قوی کے حکم میں ہے، جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہی حکم لائف انشورنس کا ہے کہ اس کا کرانا جائز نہیں ہے، لیکن کرا ہی لیا تو اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ یہ رقم بعد میں واپس ملتی ہے، لیکن گاڑی دوکان اور کاروبار کے انشورنس میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس کا ملنا یقینی نہیں ہوتا، لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، یہ بھی خیال رہے کہ گاڑیوں کا انشورنس جبری ہے، لہٰذا اس کا کرانا ایک مجبوری ہے اور جائز ہے، بقیہ انشورنس عام حالات میں جائز نہیں ہیں۔ (ہندیہ: ۱/ ۱۷۵، شامی: ۲/ ۳۸، نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۱۴۷ وما بعد)

مال تجارت کی زکوٰۃ: جس سامان کی خریداری تجارت کے لیے کی ہو، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ غلہ ہو یا برتن ہو، کپڑے ہوں یا زمین، جائیداد، فلیٹ اور رہائشی پلاٹ جیسی چیز ہو، سال گزرنے پر ان سب چیزوں پر موجودہ قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن کسی سامان کو ذاتی استعمال کے لیے خریدا تو اس پر

زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر کسی پلاٹ یا فلیٹ یا کسی اور چیز کو تجارت کے لیے خریدا، پھر نیت بدل گئی اور اس کو ذاتی استعمال میں لینے کا ارادہ کرلیا تو اب اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر ذاتی استعمال کے لیے خریدا پھر ارادہ بدل گیا اور تجارت کی نیت کرلی تو جب تک تجارت شروع نہ کردے صرف نیت کی تبدیلی سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، یہ خیال رکھنا چاہیے کہ فلیٹ اور پلاٹ کی زکوٰۃ جب بھی واجب ہو اس کا اندازہ اس کی موجودہ قیمت سے کیا جائے گا نہ کہ اس قیمت کا جس سے اس کو خریدا ہو، یہی حکم تمام تجارتی اشیاء کا بھی ہے۔ (شامی: ۲/۱۴)

شیئرز پر زکوٰۃ: اگر کسی شخص نے شیئرز صرف اس مقصد کے تحت خریدے ہیں کہ میں اس کو آگے فروخت کرکے اس سے نفع حاصل کروں گا تو اس صورت میں ان شیئرز کی زکوٰۃ نکالتے وقت مارکیٹ میں جو مالیت ہو اس کا کل مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر مقصد شیئرز کی خرید وفروخت نہیں ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ سالانہ منافع حاصل کرنا ہے (خواہ دل میں یہ خیال بھی ہو کہ اگر اچھی قیمت ملی تو اس کو بیچ دیں گے) تو اس صورت میں زکوٰۃ اس شیئرز کی مارکیٹ قیمت کے اس حصے پر واجب ہوگی جو قابل زکوٰۃ اثاثوں کے مقابل ہوگی، مثلاً: اگر ایک ہزار کا شیئر ہے تو اس کا کچھ حصہ بلڈنگ اور مشینری کے مقابلہ میں ہوگا اور کچھ خام مال، تیار مال اور نقد روپیوں کے مقابلہ میں، تو اس کا پتہ لگا لیا جائے، بلڈنگ اور مشینری کے مقابلہ میں جتنا حصہ ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، بقیہ پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(ہندیہ: ۱/۱۸۰، فقہی مقالات: ۱/۱۵۵-۱۵۹)

کرایہ پر چلائے جانے والے برتن اور گاڑی وغیرہ پر زکوٰۃ:

اگر کسی کے پاس ٹینٹ کا سامان جیسے برتن، شامیانہ، کرسی اور چارپائی وغیرہ ہے جس کو وہ کرایہ پر دیتا ہے، یا کسی کا ٹرانسپورٹ کا بزنس ہے جس کے تحت وہ کار، بس یا ٹرک وغیرہ کرایہ پر چلاتا ہے تو ان برتنوں یا گاڑیوں کی مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، بلکہ اگر ان سے حاصل ہونے والی آمدنی خود سے یا دوسرے مال کے ساتھ مل کر نصاب تک پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ ہوگی، یہی حکم ان مکانوں کمروں گیسٹ ہاؤس یا ہوٹل وغیرہ کا ہوگا جن کو کرایہ پر اٹھایا جاتا ہے۔ (ہندیہ: ۱/۱۸۰)

جس مال کے ملنے کی امید نہ ہو اس کے ملنے پر زکوٰۃ کا مسئلہ:

کسی مال پر زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوتی ہے جب اس پر ملکیت کے ساتھ ساتھ اس کا قبضہ ہو یا اس کے نائب کا قبضہ ہو جس سے لے کر وہ اس میں تصرفات کرسکتا ہو، جیسا کہ بینک میں جمع کرنے کی صورت میں ہوتا ہے، لیکن اگر مال کے ملنے سے کسی سبب سے مایوسی ہوجائے، مثلاً: کسی نے ادھار لیا، پھر وہ انکار کررہا ہے اور اس کے پاس ثبوت موجود نہیں ہے، یا حکومت نے مال قرق کرلیا اور ملنے کی کوئی امید نہیں ہے یا مال سمندر میں گر گیا، یا کسی صحرا وغیرہ میں دفن کردیا اور اس کی جگہ بھول گیا تو اگر بعد میں یہ مال مل جائے تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ ملنے کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (ہندیہ: ۱/۱۷۴)

پرائیویٹ فنڈ پر زکوٰۃ: پرائیویٹ فنڈ اگر جبری ہو، تو اس پر بھی زکوٰۃ فی الحال واجب نہیں ہوگی، ملازمت ختم ہونے کے بعد جب رقم ملے گی تو آئندہ سالوں میں اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ اگرچہ وہ اس کی ملک میں ہے لیکن وہ اس پر تصرف پر قادر نہیں ہے، لیکن اگر پرائیویٹ فنڈ اختیاری ہو چاہے کٹوائے چاہے نہ کٹوائے اور کٹوانے پر بھی جب چاہے نکال لے تو اس کی حیثیت بینک میں جمع کی جانے والی رقم کی طرح ہے اور اس کی زکوٰۃ سال بسال نکالنی واجب ہے۔ (ہندیہ: ۱/۱۷۴)

مال مرھون پر زکوٰۃ: اگر زیور وغیرہ گروی رکھا ہو تو اس کی زکوٰۃ نہ رکھنے والے پر ہوگی، نہ مرتہن (جس کے پاس گروی رکھا گیا) پر، چنانچہ جب اس کو چھڑا لیا جائے تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (شامی: ۲/۷)

ڈپوزٹ کی رقم پر زکوٰۃ: رہن ہی کے حکم میں فقہاء نے اس رقم کو بھی رکھا ہے جس کو کرایہ دار مکان یا دوکان کرایہ پر لیتے وقت مالک کو دیتا ہے اور بعد میں مکان دوکان واپس کرتے وقت واپس لے لیتا ہے، البتہ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ کرایہ دار پر تو اس کی زکوٰۃ نہیں ہوگی، لیکن مالک پر ہوگی۔

(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ۵۶)

اسلام اس تغیر پذیر زمانہ میں

مولانا محمد ناظم ندوی (مانک منو- سہارنپور)

اکثر مؤرخین، مصنفین، دینی رہنما اور فلسفہ تاریخ و دعوت پر گہری بصیرت رکھنے والے نابغۂ روزگار افراد اس حقیقت کا برملا اعتراف کرتے ہیں اور پورے عزم ویقین کے ساتھ بولتے اور لکھتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل دین، مستقل تہذیب، جامع دستور، ناقابل تنسیخ شریعت، مکمل ضابطہ حیات، نظام زندگی، لائحہ عمل، اٹل قانون اور ایک آفاقی وہمہ گیر نظریہ ہے، وہ قدیم وجدید کی اصطلاح سے بالاتر ہے، اس کے اصول ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر شعبہ فکر سے متعلق ہیں، وہ نت نئے مسائل اور ہر دور کے مطالبات وتقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور اس میں ہر تغیر پذیر زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہے، کسی فلسفہ اخلاق کا دور ہو یا اختراعات وایجادات کا، کمپیوٹر کا ایڈوانس زمانہ ہو یا شعاعوں ولہروں پر کنٹرول کا، اسلام کبھی فرسودہ یا اس کے آئین کبھی پرانے نہیں ہوسکتے، وہ تو عصری آگہی کی وجہ سے ترقیات اور انکشافات کی راہ دکھاتا ہے۔

اسلام یقیناً ایک مکمل نظام زندگی ہے، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی ہر شعبہ زندگی کے لیے اس کے پاس ایک کامل ضابطہ ہے اور ہر بحران کا حل اس کے پاکیزہ دستور میں موجود ہے اور یہ صرف نقوش کی جلوہ ریزی اور الفاظ کی بازی گری نہیں ہے، بلکہ کردار وعمل اور تاریخی حقائق ومشاہدات اس کے جلو میں کارفرما ہیں۔ خود نبی ﷺ نے اس اسلامی قانون کی بالادستی سے ایک صالح تمدن اور پاکیزہ معاشرہ تیار فرمایا تھا اور پھر نبی ﷺ کے بعد آپ کے خلفائے راشدین نے اس تہذیب وثقافت کی حقیقت وصداقت کو دنیا کے بیش تر اور خود کو متمدن کہنے وسمجھنے والے خطوں میں پیش کرکے اس کے اعتراف بلکہ اسے اپنانے پر مجبور کردیا تھا اور پھر وہ اسی تہذیب اسلامی اور عدالت اسلامی کی گھنیری چھاؤں میں سکون واطمینان کا سانس لیتے تھے اور دیگر باطل ازموں کو ٹھکرا کر اسی کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔

تہامہ کے افق سے جب تہذیب اسلامی نے اپنی شمع روشن کی اور تاریکیوں کے سینہ کو چیر کر اجالے کا آغاز کیا، اس وقت پوری دنیا میں تمدنی بحران تھا، صرف ایرانی تہذیب اور رومی تمدن کا چرچا تھا، شہنشاہ ایران کے دربار میں ظاہری مرصع کاری، شاہانہ طمطراق اور آنکھوں کو خیرہ کردینے والی شان وشوکت نے لوگوں کو مرعوب کررکھا تھا، کچھ دن تو رومن امپائر بھی اس کے جاہ وجلال اور ہیبت وسطوت میں گم ہوکر رہ گیا تھا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس وقت اس سے زیادہ منظم، طاقتور اپنے دائرہ کی وسعت، ظاہری چمک دمک اور پرفریب گل کاریوں کے لحاظ سے اس شہنشاہیت سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں تھی، اسے اپنے اس تمدن پر ناز اور اپنے کلچر پر افتخار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حیرہ (عرب) کے قائد نعمان بن منذر نے ایران کے شاہانہ دربار میں (جس میں اس وقت بہت سے ممالک کے نمائندے اور سفیر تھے، انہوں نے بھی اپنے ملک کے حالات بیان کیے تھے) اپنے ملک عرب کی نمائندگی اور خطابت کے پرجوش اسلوب اور اپنی طلاقت لسانی کی وجہ سے ایسی مرصع تقریر کی جس سے بیشتر افراد کے قلوب میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ عرب کا تمدن سب سے زیادہ بہتر ہے۔ اس پر ایرانی شہنشاہ کا پارہ تیز ہوگیا اور خسرو پرویز نے اپنی نخوت اور کبر کے منفرد لہجہ اور اپنے تمدن کی بالادستی اور عرب کی تحقیر کرتے ہوئے یوں کہا کہ اے نعمان! تم ایسی قوم کو تفوق وامتیاز دینا چاہتے ہو، جس کے پاس نہ کوئی ضابطہ ہے نہ کوئی دستور وقانون، جس کا رہن سہن، بود وباش، لباس وپوشاک وحشیوں جیسا ہے، نہ وہ تمدن سے آشنا ہے نہ تہذیب وثقافت سے بہرہ ور، جنگلی جانوروں اور جنگلی قانون جیسا اس کا رویہ ہے، نہ دینی لذت اسے نصیب، نہ دنیوی تعیش، کھانے کے لیے اونٹ کا بے قیمت وبے مزہ گوشت، قتل وغارت گری اور بچیوں وبچوں کو افلاس کے ڈر سے مار ڈالنا اس کا

محبوب مشغلہ، وہ تو تمدن کے ہر جلوے سے عاری ہے۔

بہت سے تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ایران وروما کی سلطنتیں ہی اس وقت سپر پاور تھیں اور انہیں کے تمدن کی جلوہ ریزیوں نے پوری دنیا پر اپنا اثر ورسوخ قائم کر رکھا تھا، دیگر ممالک تہذیبی اور فکری اعتبار سے انہیں کے منت کش احسان تھے، لیکن اس تاریخی مشاہدے کو بھی نہ کسی قلم کار کا قلم جھٹلا سکتا ہے، نہ کسی ادیب ومصنف کے شہ پارے اور نہ کسی خطیب کی ساحری کہ اسلامی نظام عمل اور اس فکر وتہذیب نے رومن امپائر اور ایرانی ثقافت کو اپنے ہمہ گیر وجامع طریقہ کار کا گرویدہ بناڈالا اور اسی نظریہ کا پرچم پھران کے قلعوں ہی پر نہیں ان کے قلب ودماغ پر بھی لہرانے لگا، وہ اپنے ناقص لائحہ عمل کو بھول کر اسلام کے دامن رحمت میں آگئے اور ان کی معیشت ومعاشرت اور تجارت وزراعت پر یہی نظریہ چھا گیا اور ان کی ترقی کے تمام منصوبے اسلام کے زیر سایہ پروان چڑھنے لگے۔

اسلام کے آفاقی وہمہ گیر نظریہ اور ترقی یافتہ اور تغیر پذیر زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت کی بنیاد پر بہت سے مفکرین اور عالمی بصیرت رکھنے والے افراد نے لکھا ہے کہ جب نئی دنیا امریکہ کی دریافت ہوئی اور اس قوم میں یقیناً آگے بڑھنے، ارتقاء کی شاہراہ تلاش کرنے اور کائنات کے اسرار ورموز کا انکشاف کرنے اور بہت سی اشیاء کی جستجو کے بعد انہیں حقائق کا روپ دینے کی صلاحیت تھی، ابتداء میں بدقسمتی سے اس قوم کو عیسائی مذہب سے واسطہ پڑا اور یہ عیسائی تمدن اس میں ایڈوانس دور کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں، وہ انسان کے دوش بدوش نہیں چلتا، اس کی ترقی کی معراج تو صرف خلوت گزینی اور اس میں ریاضت ومجاہدات ہے، حقائق کونیہ کی تسخیر اور نوامیس فطرت کی تلاش وجستجو سے کوئی واسطہ نہیں، جب کہ اسلام فکر کائنات کو عقلمندی کی دلیل اور اجر عظیم کی بات کہتا ہے، اس کے لیے اگر امریکن قوم کو پہلے عرصہ میں اسلام سے واسطہ پڑ جاتا تو آج اس پورے براعظم کا مذہب اسلام ہوتا اور دنیا کو معلوم ہو جاتا کہ اسلام کے قوانین کس نظم ومحبت کا مظاہرہ کرنے والے اور پوری دنیا کو امن وشانتی کا پیغام دینے والے ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مذہب کی یہ تنگنائی کائنات کی اشیاء کے ادراک اور تجسس میں مانع ہے تو انہوں نے اس مذہب سے پیچھا چھڑا کر آزادانہ رخ پر زندگی کی مہار چھوڑ دی، جس سے انہیں بھی اور دیگر جوان کے نظریہ سے متاثر ہیں بڑا نقصان پہنچا ہے اور آج اسی مغربی تہذیب کا دل دادہ ہر فرد بشر بنا ہوا ہے اور حیرت افسوس ہی نہیں بلکہ بڑے دکھ کی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کو فرسودہ نظام اور اپنے نظریہ کو کامل سمجھنے لگا۔

یہ تلخ حقیقت لکھنے پر بھی قلم مجبور ہے کہ آج بیشتر افراد اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات صرف زبان سے کہتے اور قلم سے لکھتے تو ہیں لیکن ان کا دل اور ان کا کردار وعمل اسے فرسودہ بتلاتا ہے، دنیا کے مروجہ ازموں کی ہم دن رات دُہائی دیتے ہیں اور اسلام کے نظام کو آج کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کا اہل نہیں سمجھتے، پوری دنیا کے نقشہ پر پچاس کے قریب مسلم مملکتیں ہیں، لیکن ان میں ایک بھی ایسی سلطنت نہیں ہے جہاں اسلام کا مکمل نظام زندگی رائج ہے، بلکہ اس کی سنجیدہ کوشش بھی نہیں ہو رہی ہے اور یہ لکھتے ہوئے دل کے احساسات مجروح ہیں کہ سعودی مشاورتی کونسل کے صدر شیخ بن زبیر نے یہ اعلامیہ جاری کیا کہ اس وقت اور ان حالات میں اسلامی بنیادوں پر الیکشن ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ انتخابات میں کنوینسنگ کرنی پڑتی ہے اور اپنی انتخابی مہم میں تشہیر کی بھی ضرورت ہے، دوسروں کی کردار کشی بھی ہوتی ہے اور اس طرح اسلامی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، عرض یہ ہے کہ اسلامی بنیادوں کے مطابق ہی انتخاب کیوں نہیں کیا جاتا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی اصول، ضابطے کیوں نافذ نہیں کیے جاتے، کیا یہ سب قوانین نافذ العمل نہیں ہیں، لیکن حکومتوں کی گھیرابندی، ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق، فکر ونظر کی مجبوری، دوسری تہذیب کی چھاپ اور افکار پریشاں نے ایسا قلادہ گلے میں ڈال دیا ہے جس سے نکلنا بہت مشکل ہے۔

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگ تخیل
ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے

محمد ارمغان بدایونی ندوی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالی جماعت دنیائے انسانیت کی سب سے بہترین جماعت تھی، خدا و رسول کی محبت سے سرشار، دعوت دین کے جذبہ سے معمور اور عظیم مقاصد کی حامل، ان کے سامنے امراء وسلاطین کے دربار، دنیا کی متمدن تہذیبیں اور ظاہری چمک دمک کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہ تھی، بلکہ ان کا جینا مرنا، اٹھنا بیٹھنا اور چلنا پھرنا اسلامی خط وخال پر تھا اور رسول اللہ ﷺ کی چشم وابرو کے مطابق تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگیاں اپنوں اور غیروں کے لیے یکساں طور پر جاذب نظر اور باعث رشک تھیں، ان کو نبی اکرم ﷺ کی ذات پر غیر معمولی فخر اور آپ کی سنتوں سے حد درجہ عشق تھا، انہیں اسلامی تعلیمات پر سو فیصد شرح صدر تھا اور اسی لیے احساس کمتری ان کو چھو کر بھی نہیں گذرا تھا، ایک زندہ قوم کے جینے کا یہ وہ عنصر تھا جس نے ہر نشیب وفراز سے گذرنے پر آمادہ کردیا تھا، پھر ان کے لیے راہ حق کی مشکلات پر صبر کرنا، دعوت کے مشن میں استقامت برتنا، میدان جنگ میں سینہ سپر ہونا، دشمنان اسلام کی پھبتیاں برداشت کرنا یا غربت وفاقہ کشی کی زندگی بسر کرنا بہت زیادہ معمولی بات تھی، کیونکہ ان کا تصور آخرت انتہائی مضبوط تھا اور وہاں کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی ہر چیز ان کے لیے ہیچ تھی۔

مشہور صحابی رسول حضرت عامر بن فہیرہؓ کی شہادت کا واقعہ ہے، جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تو آخری وقت میں ان کی زبان سے ایک عجیب جملہ نکلا، جیسے ہی ان کو تیر لگا تو وہ بولے: "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" (رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا)

ایک ایسے وقت میں جب کہ انسان دشمنوں کے نرغہ میں ہو اور جاں کنی کا عالم ہو، پھر بھی زبان سے ایسے خود اعتمادی کے الفاظ کی ادائی معمولی بات نہیں ہے، جبار بن سلمیٰ کہتے ہیں کہ عامر بن فہیرہ کا یہی وہ آخری جملہ ہے جو میرے قبول اسلام کا سبب بنا، میں محو حیرت تھا کہ کوئی شخص اپنے آخری وقت میں جھوٹ کیسے بول سکتا ہے، پھر عربوں کے مزاج میں یوں بھی جھوٹ بولنا شامل نہیں ہے، لیکن یہ کیسی کامیابی ہے جس کا تذکرہ عامر بن فہیرہؓ نے اپنے آخری وقت میں بیان کیا، چنانچہ انہوں نے تحقیق شروع کی تو پتہ چلا کہ انہوں نے شہادت کا جام نوش کیا اور انہیں اپنی حسن عاقبت کا یقین تھا، اس لیے انہوں نے موت کو کامیابی سے تعبیر کیا تھا، جبار بن سلمیٰ کو جب اس حقیقت حال کا علم ہوا تو وہ فوراً حلقہ گوش اسلام ہوگئے۔

عامر بن فہیرہ کے واقعۂ شہادت اور جبار بن سلمیٰ کے قبول اسلام' ان دونوں ہی واقعات میں امت مسلمہ کے لیے درس عبرت ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ دین اسلام میں فطری طور پر کشش موجود ہے، بشرطیکہ اس کے حاملین کردار کے غازی ہوں، انہیں دیکھ کر غیروں میں ایک تجسس پیدا ہو اور وہ یہ گواہی دینے پر مجبور ہوجائیں کہ یہ ایسے مذہب کے نام لیوا ہیں جو اپنے اصول سے سودا نہیں کرسکتا، ان کے نزدیک، دولت، راحت، طاقت، عزت، شہرت کی اہمیت گرد ہے، کوئی چیز ان کے تصور آخرت کو کمزور نہیں کرسکتی اور کوئی لالچ ان کے آہنی عزائم میں دیوار نہیں بن سکتا۔

غور کا مقام ہے کہ ایک صحابی رسول کی زندگی ایسی مبارک اور داعیانہ تھی کہ وہ آخری وقت میں بھی اسلام کا پیغام دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے، حتی کہ دشمنان دین یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ یہ واقعی کسی ایسی چیز اور خزانہ کے مالک ہیں جو ہماری نظروں سے مخفی ہے، ورنہ موت کو کامیابی سے تعبیر نہ کرتے۔ اسی کے بالمقابل ہم لوگ ہزاروں برس سے غیروں کے ساتھ رہ رہے ہیں، مگر آج تک اپنا کوئی داعیانہ کردار ان کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہیں، ان کی نظروں میں ہم سوائے چند مذہبی رسومات کی پابندی کے کوئی الگ قوم نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے ہر مصیبت بزدلی اور کوتاہ ہمتی کا سبب بنتی ہے، جب کہ صحابہ کے لیے مصیبتیں ترقی کا زینہ ثابت ہوئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام چند رسومات کا قائل نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ پوری زندگی اسی کے قالب میں ڈھالی جائے۔

اجتہاد کے میدان میں جمود و تعطل

مسلمانوں کے زوال کا ایک سبب

محمد نفیس خاں ندوی

دورِ عروج کے بعد کئی صدیوں تک مسلمان علم و تحقیق کے میدان میں سست خرام بلکہ گمنام رہے، ان کی تعلیم و تدریس کا محور علوم اوائل تک ہی محدود رہا، تعلیمی و تحقیقی اداروں میں یہ ذہنیت مستولی رہی کہ اسلاف جو کارہائے نمایاں انجام دے گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرف آخر ہے، اب اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا، بڑی سے بڑی علمی و تحقیقی خدمت بس یہی ممکن تھی کہ اسلاف کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے چڑھائے جائیں، محققین و مدرسین اسی مشغلہ کو علمی معراج سمجھتے رہے، کسی نئی تحقیق، نئی دریافت، نئی فکر کا علم مشکل ہی سے ان صدیوں میں ملتا ہے۔

دولت عثمانیہ کے آخری دور میں یہ دعویٰ کرنا کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے ایک بہت بڑا جرم اور گناہ کبیرہ خیال کیا جاتا تھا، آخرش امت مسلمہ کو اجتہاد کی بندش کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ زندگی کی تیز رفتار گاڑی رواں دواں تھی اور تقلید و جمود کا شکار مسلمان ہر نئی چیز کو رد کر رہے تھے، وہ بہت پیچھے رہ گئے اور معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا، دنیا کی قومیں نئے نئے ایجادات کر رہی تھیں، ہر نئی چیز کو لبیک کہہ رہی تھیں، اس کو استعمال میں لا رہی تھیں، وہ زندگی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھیں، لیکن مسلمان ابھی تک اسی جگہ کھڑے تھے جہاں ان کے آباء و اجداد صدیوں پہلے پہنچے تھے۔

مشہور ترکی فاضلہ خالدہ ادیب خانم کہتی ہیں: ''عثمانیوں نے علوم جدیدہ کی تحصیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ نئے خیالات کو اپنی قلمرو میں داخل ہی ہونے نہیں دیا، جب تک ملت اسلامیہ کی تعلیم کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں تھی کیا مجال کوئی نئی چیز قریب آنے پائے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم پر جمود طاری ہو کر رہ گیا، اِدھر دور انحطاط میں ان کی سیاسی مصروفیتیں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کے جھمیلے میں پڑنے کی انھیں فرصت ہی نہیں تھی۔''

منصب قیادت پر باقی رہنے کے لیے ایک بنیادی صفت ''قوت اجتہاد'' بھی ہے، یعنی وہ صلاحیت جس کے ذریعہ زندگی کے مسائل کو حل کرنا آسان ہو اور اشتباہ و تحیر کے موقع پر امت کی بھرپور رہنمائی ممکن ہو، حالات کے تقاضوں سے پوری واقفیت ہو، درپیش چیلنجز کے مقابلہ کی تیاری مکمل ہو، لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بلکہ فولاد ہو، قائدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ روح اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اتنی واقفیت اور استنباط کی ایسی صلاحیت رکھتے ہوں جس کے ذریعہ امت کی مشکلات کو حل کرسکیں لیکن بدقسمتی سے آخری ادوار میں مسلمانوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، اجتہاد کا دروازہ اس شدت سے بند ہوا کہ قرآن و حدیث کی زندہ جاوید تعلیمات بھی محض تبرک کا ذریعہ بن کر رہ گئیں، چنانچہ مسلم حکومتوں کو جب جنگوں کا سامنا ہوتا تو جنگی پالیسیوں پر غور کرنے اور نئے آلات حرب و جدال تیار کرنے کے بجائے ''ختم بخاری'' کی مجلسوں کا اہتمام کیا جاتا۔

یہ حقیقت ہے کہ دواعی اور تقاضوں کے باوجود اگر اجتہاد کے دروازے بند کردیے جائیں تو لامحالہ دو میں سے ایک چیز ضرور سامنے آئے گی، یا تو زندگی جمود کا شکار ہوگی اور اس کی نشو و نما رک جائے گی یا وہ ان مقررہ سانچوں کو توڑ کر یوں آزاد ہو جائے گی کہ شریعت کے دائرہ کو پھلانگ کر الحاد کی سرحد تک جا پہنچے اور یہ دونوں چیزیں یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوئیں، پہلے جمود طاری ہوا پھر اس کے بعد شریعت سے بغاوت کا رجحان پیدا ہوا۔

آپ مسلم دنیا کی بدقسمتی ملاحظہ کیجیے کہ دنیا کی سو بڑی یونیورسٹیوں کی فہرست میں مسلم دنیا کی ایک بھی یونیورسٹی نہیں آتی، ساری مسلم دنیا مل کر جتنے ریسرچ پیپر تیار کرتی ہے وہ امریکہ کے شہر بوسٹن میں ہونی

والی ریسرچ کا نصف مانا جاتا ہے، پوری مسلم دنیا کے امراء وحکمراں علاج ومعالجہ کے لیے یورپ وامریکہ جاتے ہیں، یہ اپنی زندگی کے آخری ایام یہیں گذارنا چاہتے ہیں۔ ہم نے گذشتہ پانچ سو سال میں دنیا کو کوئی ہتھیار، کوئی دوا، کوئی فلسفہ، کوئی اچھی کتاب، کوئی اچھا کھیل اور کوئی اچھا قانون نہیں دیا، ہم نے قرآن مجید کی اشاعت کے لیے کاغذ، پرنٹنگ مشین اور سیاہی ہی بنالی ہوتی تو ہماری عزت رہ جاتی، ہم تو خانہ کعبہ کے غلاف کا کپڑا بھی اٹلی سے تیار کراتے ہیں، حرمین شریفین کے لیے ساؤنڈ سسٹم بھی یہودیوں سے خریدتے ہیں، ہمارے لیے آب زم زم بھی کفار کی کمپنیاں نکالتی ہیں، ہماری تسبیحات اور جائے نمازیں بھی چین سے آتی ہیں، ہمارے احرام اور کفن بھی جرمن مشینوں میں تیار ہوتے ہیں، ہم مانیں یا نہ مانیں دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمان صارف سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، یورپ نئی نئی چیزیں ایجاد کرتا ہے، تیار کرتا ہے اور مسلم ممالک تک پہنچاتا ہے، ہم استعمال کرتے ہیں اور پھر اس کے بنانے والے کو آنکھیں دکھاتے ہیں۔ آپ یقین کیجیے جس سال آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے سعودی عرب کو بھیڑیں دینے سے انکار کردیا اس سال مسلمان حج کے موقع پر صحیح سے قربانی نہیں کرسکیں گے اور جس دن یورپ وامریکہ نے مسلم دنیا کو گاڑیاں، جہاز اور کمپیوٹر بیچنا بند کردیا ہم اسی دن گھروں میں محبوس ہوکر رہ جائیں گے۔

ڈاکٹر احمد شلبی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے علمی وفکری جمود کے سنگین نتائج سامنے آئے، ایک ایسی نسل پروان چڑھی جس نے یہ سمجھ لیا کہ فقہاء میں اجتہاد کا فقدان درحقیقت اسلام کے جمود پسند مزاج کا نتیجہ ہے اور اسلام ایک ایسا جامد مذہب ہے جو تغیر پذیر حالات کی رہنمائی اور دنیا کو درپیش نت نئی تحدیات کے مقابلہ کی توانائی سے محروم ہے، پس دین پر سے نہ صرف ان کا اعتماد اٹھتا گیا بلکہ دیندار لوگ ان کی نظروں میں حقیر وبے حیثیت ہوتے گئے۔

چنانچہ عالم اسلام جب مغرب کے قبضہ میں آیا تو مسلم نوجوانوں کے اندر ایک قسم کا ''احساس کمتری'' پیدا ہوچکا تھا، خاص کر جنوبی ایشیا میں جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی جو نسل تیار ہوئی وہ مغرب سے پوری طرح مرعوب تھی اور کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے ماضی پر شرمندہ ہیں اور ان کا یہ عقیدہ بن چکا تھا کہ مغرب ہر معاملہ میں ان سے بہتر ہے۔

علم وفکر کے دور انحطاط میں مسلمانوں کی قیادت ایسے ہاتھوں میں آئی جن کی ساخت وپرداخت مغربیت کے سانچوں میں ہوئی تھی، انھوں نے اپنی دانست میں مسلمانوں کے زوال کی گتھی سلجھالی اور ببانگ دہل یہ نعرہ لگایا کہ اس قوم کی ضرورت صرف اور صرف ''تعلیم'' ہے، اگر اس قوم کے افراد مغربی زبانیں سیکھ کر اہل مغرب کی طرح اس میں مہارت حاصل کرلیں اور ان کے پیش کردہ جدید علوم سے واقف ہوجائیں تو قوم کی تمام مشکلات خود حل ہوجائیں اور زوال وانحطاط کی ساری رسوائیاں دور ہوجائیں، اسی فکر وخیال کے تحت انھوں نے مغربی طرز پر اسکول وکالجز قائم کیے، جہاں طرز تعلیم وتدریس اور نصابیات میں وہ پوری طرح مغربی آقاؤں کے مقلد تھے، البتہ مسلمانوں کے دینی جذبہ کی رعایت کرتے ہوئے اس میں دینیات کے شعبہ کا اضافہ بھی کیا اور اسی جذبہ کی بنا پر ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ''اسلامیہ کالج'' اور ''مسلم یونیورسٹی'' کا نام بھی دیا۔

یہاں اس حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے کہ ہر علم کی ایک خاص روح اور اس کا ایک خاص ضمیر ہوتا ہے، اسلام نے جن علوم کی بنیاد ڈالی اور اپنے قالب میں ڈھالا ان سب میں ایمان، تقویٰ اور خشیت الٰہی کی روح پورے طور پر موجود تھی، حتی کہ مسلمانوں نے جن علوم کو سنوارا اور اصلاح کی وہ بھی دینی روح سے خالی نہیں تھے، لیکن اسلام کے بالمقابل یورپ نے جن علوم کو مدون کیا ان میں انکار خدا، مادہ پرستی، محسوسات پر ایمان اور غیر محسوسات سے بے اعتنائی پورے طور پر موجود ہے۔ چنانچہ اس مغربی نظام تعلیم پر مسلمانوں کی بے پناہ دولت بھی صرف ہوئی، ہونہار بچے اور بہترین جوان بھی ان تعلیم گاہوں کے لیے وقف ہوئے، لیکن ان تمام جدوجہد کا نتیجہ کیا نکلا؟ ایک عام فکری بے راہ روی، افکار وخیالات میں تضاد وناہمواری اور دین میں شک وتذبذب اور اخلاق وادب سے بیزاری، یہ وہ اثرات ہیں جو نئی تعلیم یافتہ جماعت میں ظاہر ہوئے، اس طرح مسلم قوم کے زوال کی گتھی سلجھتی اور الجھتی رہی اور ساری توانائیاں اس کے سرے کی تلاش میں ضائع ہوتی رہیں۔

اصلاحی خطبات

سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت

جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی

''جس قوم کا نام مسلمان ہے اور جو کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر ایمان لائی ہے وہ اگر چہ سر سے لے کر پاؤں تک مغربی اقوام کا طریقہ اپنا لے اور اپنا سب کچھ بدل دے تب بھی ساری زندگی کبھی ترقی نہیں کرسکتی، ہاں! اگر وہ ترقی کرنا چاہتی ہے تو ایک مرتبہ (معاذ اللہ!) اسلام کے چولے کو اپنے جسم سے اتار دے اور یہ کہہ دے کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، پھر ان کے طریقوں کو اختیار کرلے تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی دنیا میں ترقی دے دیں گے، لیکن مسلمان کے لیے وہ ضابطہ اور قانون نہیں ہے جو کافروں کے لیے ہے، مسلمان کے لیے دنیا میں بھی ترقی کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی کا کوئی راستہ نہیں۔

سنت صرف انہی چیزوں کا نام نہیں کہ آدمی دائیں ہاتھ سے کھانا کھالے اور دائیں طرف سے کپڑا پہن لے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے سے سنتوں کا تعلق ہے، ان سنتوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بھی داخل ہیں، آپ لوگوں کے ساتھ کس طرح معاملہ فرماتے تھے؟ کس طرح خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے تھے؟ کس طرح لوگوں کی تکلیفوں پر صبر فرماتے تھے؟ یہ سب باتیں بھی ان سنتوں کا حصہ ہیں، لیکن کوئی سنت ایسی نہیں ہے جس کو چھوٹا سمجھ کر اس کی تحقیر کی جائے، فرض کریں کہ اگر کسی شخص کو کسی سنت پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہورہی ہے تو کم از کم اس شخص کو بہتر سمجھے جس کو اس سنت پر عمل کرنے کی توفیق ہورہی ہے، لیکن اس سنت کا مذاق اڑانا، اس کی تحقیر کرنا، اس کو برا قرار دینا، اس پر آوازیں کسنا، ان افعال سے اس شخص پر کفر کا اندیشہ ہے، اس لیے ادنیٰ سے ادنیٰ سنت کے بارے میں بھی کبھی تحقیر اور تذلیل کا کلمہ زبان سے نہیں نکالنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین!''

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 13 ⚜ October 2021 ⚜ Issue:10

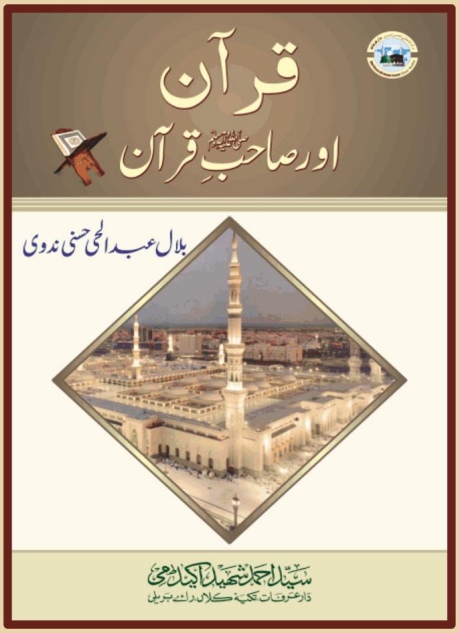

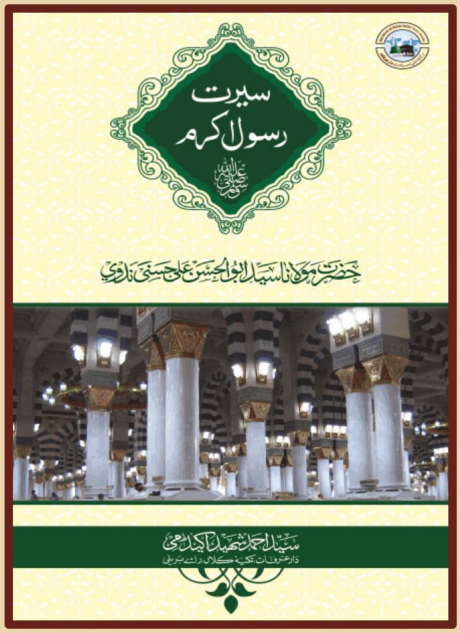

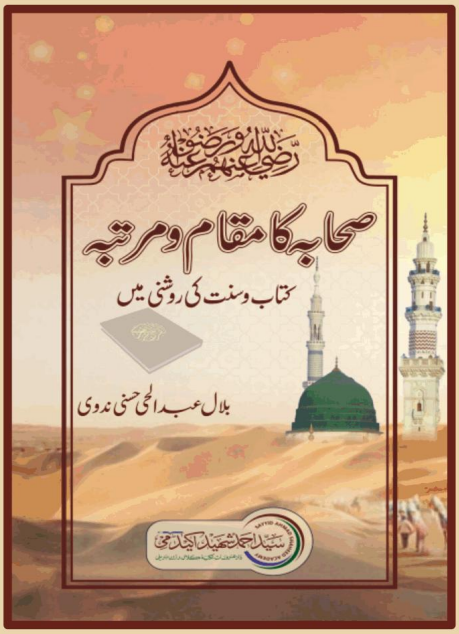

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)